

File No 2

12

سلسلہ اشاعت امامیہ نیشن پاکستان سٹیڈیو لاہور ۲۲

تاریخ اسلام میں

واقعات کی اہمیت

MAAB 1431

از قلم حقیقت رقم

مرکز احیاء آثار

مسٹر کار سید العطار علامہ علی نقی نقوی مجتہد العصر

مدظلہ

قیمت ۲/-

## امامیہ مشن پاکستان ریسرچ ڈیپارٹمنٹ لاہور

کا شاندار تبلیغی شاہکار رسالہ ۲۴ آپ کے زیر نظر ہے۔

یہ خلاصہ ہے اس تقریر کا جو سرکار سید العلماء علامہ علی نقی نقوی نے ۱۳۶۵ھ میں ہزار ہا افراد کے مجمع میں لنگاپور شاد مہمبوریل مال لکھنؤ میں فرمائی یہ کامیاب تبلیغی تقریر اخبار پیام اسلام میں شائع ہو کر تمام حلقوں میں داد تحسین حاصل کر چکی ہے۔ تاریخ اسلام کا جو ہر امام حسینؑ کا تذکرہ ہے جو ہر دم تازہ ہے اور یہ تقریر گلشن عزا کا سدا بہار بھول ہے۔ اس کو بار بار پڑھنے سے بھی دل سیر نہیں ہوتا۔ بلکہ ہر مرتبہ دل و دماغ ایک تازہ اثر لیتا ہے۔ صداقت اسلام اور عظمت آل محمدؑ کے احساس سے جنت بدوش کیفیت طاری ہو جاتا ہے۔

محرم کے ایام میں اس کی کثیر اشاعت پر مجاہدین حسینؑ کو خاص توجہ فرمانا چاہئے۔ تبلیغ حسینیت خدمت اسلام کا بہترین ذریعہ ہے۔

خادم دین سید حسن علی شاہ کاظمی

سیکرٹری امامیہ مشن ریسرچ ڈیپارٹمنٹ لاہور

ذوالحجہ ۱۳۸۵ھ - جولائی ۱۹۵۶ء

## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تاریخ اسلام کی ابتدا کب سے ہوتی ہے؟ مذہبی نقطہ نظر سے تو اسلام اس وقت سے شروع ہوتا ہے جبکہ دنیا وجود میں بھی نہ آئی تھی اور آدم و نینو دیگر انبیاء و مرسلین اسلام ہی کا پیغام لے کر دنیا میں آئے، لیکن مذہبی معتقدات سے قطع نظر کرتے ہوئے خالص تاریخی حیثیت سے تاریخ اسلام کی ابتدا اس وقت سے ہوتی ہے، کہ جب سے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث برسات ہوئے۔

اس وقت کی حالت یہ تھی کہ دنیا کے مختلف ممالک میں جن رہنماؤں کی تعلیم جاری تھی ان میں کسی میں بھی ہمہ گیر انسانی برادری کا تخیل موجود نہ تھا۔ بلکہ یہ تعلیمات صرف ایک قوم، ایک ملک اور ایک زمانہ میں محدود تھیں۔ ہندوستان ہی کو لیجئے یہاں جس طرح کی تعلیم رائج تھی۔ اس نے اپنے پیغام کو مندر کے حدود کا پابند بنا دیا تھا، وہ اپنے ماتنے والوں کو مندر کے عبور کرنے کی اجازت ہی نہیں دیتا تھا۔ تو اسے مندر پار والوں کے اصلاح کی فکر کیا ہوتی۔

دوسرا بڑا مذہبی ادارہ عیسائیت کا تھا۔ اس کی تعلیم کا زادنیہ نگاہ پر وراج یافتہ بائبل میں پایا جاتا ہے اسی سے ظاہر ہے کہ وہ اللہ کو صرف بنی اسرائیل کا باپ قرار دیتا ہے۔ اگر اللہ کو صرف اس کے رحم و کرم اور عنایت کی بنا پر باپ کے نام سے تعبیر کیا جاسکے تو اس کی رحمت کا مستحق دنیا کے سارے انسانوں کو ہونا چاہئے۔ مگر عیسائیت کی مذہبی تعلیم اس وسیع النظری سے خالی تھی۔

خود عرب کے لوگ اپنے مقابلہ میں دنیا کی کسی قوم کی کچھ حقیقت نہ سمجھتے تھے۔ انہوں نے اپنا نام رکھا تھا "عرب" یعنی دل کی بات کو زبان سے ظاہر کر سکنے والے اور اپنے

سوا دوسری قوموں کو کہتے تھے "عم" یعنی گونگے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے سوا دیگر اقوام کی زبانوں کو انسانی زبان ماننے کیلئے تیار نہ تھے۔ بلکہ جیسے جانور کچھ آوازیں نہیں نکالتے ہیں، ویسی ہی دوسری قوموں کی بولیاں ہیں۔

ایسے زمانہ میں حضرت محمد مصطفیٰؐ اسلام کا پیغام لیکر آئے۔ جس کا خاص جوہر تھا "بین الاقوامیت" یعنی وہ صرف عربوں کیلئے نہیں بلکہ دنیا کی تمام قوموں کیلئے تھا۔ ابھی تک کسی نے اتنا بڑا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ انہوں نے کل انسانوں کو انوث اور مساوات کا سبق دیا۔ ذات پات کے بدنامہ اصول کو درمیان انسانیت سے دھو ڈالا۔ کل انسانوں پر یکساں فرماں عائد کئے اور سب کے حقوق مساوی رکھے۔ آپ نے اعلان کر دیا لا فخر للقرشی علی غیر القرشی ولا للعربی علی غیر العربی کوئی فخر نہیں قرشی کو غیر قرشی پر اور عربوں کو غیر عربی پر سب آدم کی اولاد ہیں (خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ) اللہ نے تم سب کو ایک نفس سے پیدا کیا ہے۔

یہ اب ہمیں آسان معلوم ہوتا ہے جبکہ ہمارے کان سنتے سنتے عادی ہو چکے ہیں لیکن جس زمانہ میں رسولؐ ان خیالات کو پھیلا رہے تھے اس وقت دنیا ان سے بالکل اجنبی تھی۔ اس وقت دنیا کی تمام قوموں میں برادرانہ برتاؤ قائم کیا جانا کیسا اپنے ہی ملک و قوم کے دوسرے قبیلہ کے افراد کی اپنے سامنے کچھ حقیقت نہ سمجھتے تھے۔ اس ماحول کے اعتبار سے رسولؐ کا یہ اقدام ایک بڑی غیر معمولی حیثیت رکھتا تھا۔ قول عمل مشکل ہے۔ رسولؐ نے زبانی ہی تعلیم نہ دی بلکہ ہر موقع پر خود عمل کر کے دکھادیا۔ انہوں نے اپنے ماحول سے دنیا کے سامنے ایک بین الاقوامی قوم کی تشکیل کر کے دکھادی جس میں اگر ایک طرف حمزہ و ہجرت ایسے قرشی تھے تو دوسری طرف ابوذر غفاریؓ اور مقداد کندیؓ

ایسے غیر قرشی اور غیر سلمان فارسی، بلال حبشی اور صہیب رومی ایسے غیر عرب اتنا ہی نہیں بلکہ سلمان کو من اهل البیت کہہ کے اعزاز میں اپنے خاندان کا شریک کر لیا۔ اور بلال کو مؤذن کے عہدہ پر فائز کر کے یہ بھی بتا دیا کہ اگر کوئی شخص کسی بلند عہدہ و منصب کا اپنے ایمان و عمل سے حقدار ہو تو اس میں رنگ و نسل اور ملک کے افتراق کی ہرگز پرہیز نہیں کرنا چاہئے۔ حقیقی مصلح وہی ہے کہ جو ماحول کے خلاف ایسے حامی کی مخالفت کی پرہیز نہ کرتے ہوئے ضروری اقدام عمل میں لائے۔

رسول اللہ کی جانب سے تمام دنیا کے سامنے ایک ایسی تعلیم کو پیش کرنا چاہتے تھے جو اسے

بلند انسانی سطح پر پہنچا دے اسی لئے انہوں نے تمام اقوام عالم کے ملتے ایسا انداز اختیار کیا جس میں عقل و انصاف کی رو سے کسی کو بنائے نفاصت قائم نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر وہ تمام قدیم پیشوا یا ان مذاہب میں اس کا فیصلہ کرنے کیلئے کھڑے ہو جاتے کہ کون پیشوا حقیقت میں منصب رسالت پر فائز تھے اور کون نہیں تھے تو وہیں سے ایک جنگ ان شخصیتوں کے بارے میں قائم ہو جاتی جس کا کوئی عملی نتیجہ انسانی کردار کے مستقبل کے لحاظ سے نہ تھا۔ اسلئے انہوں نے اقوام عالم کے گزشتہ پیشواؤں میں سے نفی کسی کی نہیں کی۔ بلکہ قرآن میں لفظ کے نام کے ساتھ یہ اعلان کر دیا کہ **رَسُولًا مِّنْ دُونِهَا لَقَدْ فَضَّلْنَاكَ عَلَى الْغَالِبِينَ وَرَسُولًا مِّنْ دُونِهَا لَقَدْ فَضَّلْنَاكَ عَلَى الْغَالِبِينَ** کچھ پیغمبروں کا ہم نے تمہارے سامنے ذکر کیا ہے اور بہت سے پیغمبروں کا ذکر نہیں کیا ہے ہر ایک مذہب کے قدیم پیشوا کیلئے یہ مسکن باقی رہ گیا کہ اسکا شمار بھی ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں میں ہو اور اس طرح یہود کیلئے بھی اس طرح یہ موقع ہے موسیٰ کی عظمت کے قائل رہتے ہوئے، عیسائیوں کیلئے موقع ہے کہ عیسیٰ کی عظمت بشری کے قائل ہوتے ہوئے اسلام کے دائرہ میں

داخل ہو جائیں اسی طرح پارسیوں کیلئے موقع حاصل ہے کہ زردشت کی عظمت کو ماننے کے ساتھ، ہندوؤں کیلئے موقع ہے کہ اپنے سابق پیشواؤں کی عظمت کو انسانی حدود میں ماننے کے ساتھ ساتھ اسلام کے پیغام کو قبول کر لیں، اب ان سابق شخصیتوں کے انحراف اور عدم احترام

کوئی بحث نتیجہ خیز بھی نہیں۔ جبکہ آئندہ کیلئے لائحہ عمل سب کی طرف سے ایک قبول کر لیا جائے اور وہ وہی کہ جسے اسلام دنیا کے سامنے پیش کر رہا ہے۔

یہ ہے بین الاقوامی جماعت کو متحدہ مقصد پر مجتمع کرنے کا صحیح طریقہ جسے اسلام نے اختیار کیا اور اس میں کامیابی حاصل کی، بیشک قرآن عربی زبان میں اترا۔ اس میں ایک پہلو تھا اس کا کہ عرب قوم جو دوسروں پر فوقیت کی دعویٰ کرتی تھی اسے اپنے لئے باعثِ فخر قرار دیتی۔ مگر قرآن نے اس پہلو کی تشریح کر کے عرب کے اس فخر کو ختم کر دیا۔ اس نے صاف الفاظ میں کہہ دیا

وَلَوْ نزلنا علی البعض الا عجمین علیہم ما کو تو اجدہ مومنین یعنی قرآن کے عربی زبان میں نازل ہونیکا سبب صرف یہ ہے کہ عربوں میں جہالت اور تنگ نظری ایسی ہے کہ اگر یہ کسی

اور زبان میں نازل ہوتا تو یہ ایمان نہ لاتے برخلاف دوسری قوموں کے وہ اس تنگ نظری سے دور ہیں۔ وہ باوجود قرآن کے عربی ہونیکے ایمان لانے کیلئے تیار ہو سکتی تھیں اس لئے

قرآن عربی زبان میں اترا گیا۔ اس طرح قرآن مجید نے جو ایک پہلو عرب کی فوقیت کا پیدا ہوتا تھا اسے ختم کر دیا اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام کی بین الاقوامیت کے یہ معنی نہ تھے کہ ایک

قوم یعنی عرب کا غلبہ تمام دوسری قوموں پر ہو جائے بلکہ اس کے یہ معنی تھے کہ عرب اور تمام دوسری قومیں یکساں طور پر اسلام کے بلند و بڑے نظریات عقلی اور اصول اخلاقی و اجتماعی کو قبول کر کے

ایک متحدہ قوم بن جائیں۔ اس طرح وہ کسی سے کوئی چیز چھیننے کا دہلے نہ تھا بلکہ سب کو مساوی طور پر کچھ دینے کیلئے آگے بڑھ رہا تھا اور اسی لئے کسی دوسری قوم کا آدمی اسلام قبول کر کے

کسی شکست یا پسپائی کا احساس نہیں کرتا تھا۔ بلکہ فخر اور نازش محسوس کرتا تھا۔ اسلام کے ان تعلیمات میں جبر کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ اس کے صاف اعلان کر دیا کہ (لا

اکراہ فی الدین) بلکہ تبلیغ مذہب کا صرف ایک ذریعہ تھا کہ اپنی حقانیت اور عمل سے دلوں کو مسخر کیا جائے اور اپنے اصول کو دنیا کے سامنے اس طرح پیش کیا جائے کہ وہ اس سے متاثر

ہو کر اس کی خوبوں پر غور کرے اور مسلمان ہو۔

یہ ہے اسلامی تاریخ کے دورِ اول کا وہ سرسری بیان جس سے اسلام کے اعلیٰ مقاصد اور رسولؐ کے تبلیغی طریقہ کا ایک تصور ذہن میں آجاتا ہے اس کے بعد تاریخ کا ورق الٹا ہے۔ رسولؐ کی وفات ہوتی ہے اور مسلمانوں کے فتوحات کا دور شروع ہوتا ہے کوئی شبہ نہیں کہ ان فتوحات کی بنیاد اسی بن الاقوامی تخیل پر تھی جو اسلام نے مسلمانوں کے دلخ میں پیدا کیا تھا۔ مگر اس بن الاقوامیت کے حصول میں پیغمبرؐ کے طریق کار کی نوعیت پر عام طور سے غور نہیں کیا گیا، یا نگاہیں اسکی تک نہیں پہنچیں اور نہ پہنچتا چاہئے تھا کیونکہ پیغمبرؐ کے عین نگاہ کی توقع امتوں کے عوام سے کہ جن کا جمہور نام ہے فضول سی چیز ہے پیغمبر اسلام کے پیش نظر بھی فتوحات تھے اور مسلمانوں کی نظر بھی فتوحات پر ہی مگر فتوحات کے مفہوم میں دونوں جگہ فرق تھا۔ مسلمانوں کے فتوحات یہ تھے کہ دوسروں کے ملک ان سے لیکر اپنے بنائے جاتیں۔ اور پیغمبر اسلام کے فتوحات یہ تھے کہ دوسروں کو خود اپنا بنا لیا جائے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کا ملک اپنا ہو جائے۔ پہلی قسم کے فتوحات میں زمینوں پر قبضہ کیا جاتا ہے اور دوسری قسم کے فتوحات میں دلوں کو تسخیر کیا جاتا ہے۔

یہ فتوحات جنہیں مسلمانوں نے اپنا نصیب العین بنایا اس سے ممالک تو اپنے ہو گئے مگر ممالک کے رہنے والے ان فتوحات سے ہرگز اپنے نہیں ہو سکتے تھے بلکہ اس طرح کی فتح کا ایک خاصہ ہے یہ کہ مفتوح قوم میں فاتح کی طرف سے جذبہ نفرت پیدا ہو جائے۔ جب دل میں نفرت کا جذبہ پیدا ہوگا تو اچھائیوں پر نظر جائے گی نہیں اور جب اچھائیاں دیکھی نہ جائیں گی تو دلوں میں ایمان کا رجحان کیا پیدا ہوگا۔ اس قسم کے فتوحات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مفتوح قوم فتح کے خلات فرد قرار داد و جسم مرتب کر کے اور صحیح یا غلط مظالم کی داستانیں دہرائے۔ تاریخ پر نظر ڈالئے تو اسلامی فتوحات اس سے مستثنیٰ نظر نہ آئیں گے۔

ان لیا جائے کہ کتبخانہ اسکندریہ کے حملانے کا الزام غلط ہے مگر اس غلط الزام کا غائد ہونا

اور بالکل ایسے ہی الزام کا ایران کی طرف سے عائد کیا جاتا ہے مولانا شبلی نے شعر العجم میں بھی نقل کیا ہے۔ یعنی یہ کہ ایران کی قدیم شاعری اور ادبی اسٹریکچر کا ذخیرہ باقی نہیں رہا اس لیے کہ مسلمانوں نے ایران کے تمام قدیمی سرمایہ کو تلف کر دیا۔ ان غلط الزاموں کو بالکل بیکیاں دو ملکوں کی طرف سے عائد کیا جانا، خود اس کا ثبوت ہے کہ مفتوحہ ممالک کو فاتح جماعت کے ساتھ کوئی سہاروی نہیں تھی۔ جبکہ مختصمت تھی ویسی نہی جیسی ہر مفتوحہ قوم کو فاتح کے ساتھ ہوا کرتی ہے۔

رسول نے دکھا دیا تھا کہ دیکھو ممالک یوں فتح کئے جاتے ہیں حضرت علیؑ کو فتح میں کے لئے بھیجا اور انہوں نے بغیر ایک قطرہ خون بہائے ہوئے تمام ملک کو اپنا بنا لیا مگر مسلمانوں نے اس مثال کو یاد نہیں رکھا اور اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ملک تو اپنے ہو جائیں مگر ملک والے اپنے نہ ہوں۔

آل محمدؑ جن کے سرگروہ حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ تھے اس صورت حال کو دیکھ رہے تھے اور اس کے نتیجے کو محسوس کر رہے تھے۔ انہوں نے مبصرانہ سیاست وقت کی رفتار میں مزاحمت مناسب نہیں سمجھی۔ مگر انہیں اللہ تعالیٰ اور خاموش رہ کر بھی اس کام کو انجام دینا تھا جو پیغمبر اسلامؐ کی قائم مقامی میں ان کے پیش نظر تھا۔ اگرچہ ان کا کام بہت مشعل بن گیا تھا مگر ایک فرض شناس شخص شکلوں سے گھبرا کر اپنے فرض کو ترک نہیں کیا کرتا۔ انہوں نے اپنا کام یہ قرار دیا کہ غیر ملک کی زمینوں کو مسلمان اپنے قبضہ میں لائیں اور ان کے دلوں کو آل محمدؑ اپنے عمل اور سیرت کے جذب سے اپنا بنائیں اور اس طرح ان میں اسلام کے ساتھ حقیقی سہاروی پیدا کریں۔ اسی مقصد سے حضرت علیؑ نے اپنے زمانہ خلافت میں بجائے مکہ یا مدینہ کے کوڑھ کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا۔ یہ عراق کا مرکزی شہر تھا جو ایران اور حجاز دونوں کے بیچ میں واقع ہے۔ کوڑھ فوجی چھاؤنی تھا۔ اور چھاؤنی میں پانچائیاں کثرت

سے ہوتی ہیں۔ ایران کے لوگ جب یہاں آئے تو وہ ان ہی اخلاق و کردار کو جو یہاں نظر آئے اسلامی کردار خیال کرتے اور اس کی وجہ سے اسلام کے خلاف ان کی نفرت مستحکم ہوتی جاتی۔

جناب امیر نے یہاں قیام فرما کر اور اسے خاندانِ رسولؐ اور اپنے تربیت دادہ سچے مسلمانوں کی جماعت کا مرکز قرار دے کر یہ موقع فراہم کر دیا کہ ایران والے قریب سے اسلامی اخلاق و آئین کا مطالعہ کریں اور اس کے بلند انسانی خصوصیات کو محسوس کریں جبکہ آپ عملی طور پر اسی بین الاقوامی مساوات کو سمجھنے کے ساتھ نباہ کر دنیا کو دکھا رہے تھے۔ جو پیغمبر اسلام نے دنیا کے سامنے پیش کی تھی۔ جہاں غیر فرشی مالکِ اشترؓ کی اتنی عزت تھی جتنی بڑے بڑے خاندانی قریشیوں کی نہ تھی۔ اور قنبر غلام کے ساتھ وہ مراعات تھیں جو بہت سے عربوں کے ساتھ نہ تھیں۔ جہاں انسانی حقوق میں مساوات کا اتنا خیال اور ملکی و غیر ملکی تفریق کے خلاف جہاد میں اتنا اہتمام تھا کہ عرب شہنشاہ زادہ (عبید اللہ بن عمر) نے اگر ایک ایرانی ہر مزار کو ناحق قتل کر دیا تھا اور گذشتہ دور حکومت میں قاتل کی شخصیت کے اثر سے اس کا بدلہ نہ لیا گیا تھا تو اب حضرت علیؓ بن ابی طالبؓ خلیفہ ہونے کے بعد اعلان کر دیتے ہیں کہ اس ایرانی کے خون کا بدلہ لیا جانا قاتل سے ضروری ہے۔ اسلامی قانون میں عرب اور غیر عرب اور بڑے اور چھوٹے کی تفریق کی گنجائش نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عبید اللہ بن عمر جا کر حضرت علیؓ کے فریقِ مخالفت یعنی معاویہ کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ اور پھر میدانِ جنگ میں حضرت علیؓ کے مقابلہ میں آ کر قتل ہوتے ہیں۔ کیا اس سے اسلام کی اس بین الاقوامیت کا جو اسکا طرہ اقیانوس ہے ایرانیوں کو اندازہ نہ ہوا ہوگا اور کیا اس سے انہیں اسلام کے بلند اصول کے ساتھ سمجھدی نہیں پڑی ہوئی ہوگی؟ دوسرا واقعہ ایران کی شاہزادی کا حضرت امام حسینؑ کے عقد میں آنا تھا کہ ایرانیوں اور

عربوں میں رشتہٴ اُصل قائم ہو جائے۔ اور ملک و قوم کی تفریق کے مٹا دینے کا عملی سبق دنیا کو دیا جائے۔ اس وقت جب شہنشاہ فارس کی بیٹی کے دامن پر کینیزی کا داغ آ رہا تھا، امیرالمؤمنینؑ نے اپنے عزیز فرزند کے ساتھ اس کا عقد کر کے اس کو دنیائے اسلام کی ملکہ بنا دیا۔

کیا اس سے بڑھ کر ایران کو اسلام کا گرویدہ بنانے کی کوئی صورت ہو سکتی تھی کہ اُسندہ کے ہونیوالے اسلامی پیشوا (زین العابدین) اگر ایک طرف ملک عرب کے دینی شہنشاہ محمد علیؑ کے پوتے ہیں تو دوسری طرف ملک فارس کے شہنشاہ (یزیدورد) کے نواسے بھی ہیں اسکا نتیجہ تھا کہ مفتوحانہ نفرت جو ایران کو فاتح قوم اور اسکے مذہب سے ہونا چاہئے تھی دور ہو گئی اور اگر رہی بھی تو صرف ان اشخاص سے جنہوں نے براہ راست ان پر نوج کشی کی تھی لیکن اسلام اور رہنمایان اسلام سے مذہبی طور پر انہیں کوئی نفرت نہیں باقی رہی۔ بلکہ دلی محبت و الفت اور والہانہ شیفنگی و گرویدگی پیدا ہو گئی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اسکے بعد اسلامی علوم اور مذہب کی جتنی خدمت ایران نے کی اتنی خود عربوں کو نصیب نہیں ہوئی۔

چاہے سوادِ اعظم کے وہ قدیم اور متوسط دور کے علماء ہوں، جیسے اہمقی، لسانی، طبری، رازی، روانی، بوجانی، نیشاپوری وغیرہ اور چاہے فرقہ امامیہ کے ہر دور کے علماء ہوں جیسے قمی، طوسی، خوانساری، اصفہانی، رشتی، شیرازی، مانند رانی، طرانی، یزدی وغیرہ سب ہی سرزمین ایران سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک اور ثبوت ایران کے مذہبی شعوت کا دیکھئے کہ ایران میں ہمیشہ کا قائم کیا ہوا اتوار "نوروز" ہمیشہ منایا جاتا تھا۔ یہ "نوروز جمشیدی" کہلاتا تھا جو اعتدال ربیعی کے موقع پر قائم ہوتا تھا اس کے مقابل میں "مہرگان" اتوار تھا جو اعتدال خریفی کے موقع پر یعنی موسم خزاں میں ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک قوم کو اپنے قومی

تہواروں اور قومی شخصیتوں کے ساتھ محبت ہوا کرتی ہے مگر چونکہ نوروز ہی کا دن مطابق ہو گیا حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالبؑ کی جانشینی کے دن سے تو ایران نے اپنے مخصوص تہوار کی قومی خصوصیت کو قربان کر دیا۔ اس مذہبی خصوصیت پر جو اس تاریخ کو حاصل ہو گئی تھی اور نوروز بجائے "نوروز جمشیدی" ہونے کے "نوروز اسلامی" اور "نوروز علوی" بن گیا۔ اب اس میں اسلامی نماز پڑھی جاتی ہے اور حضرت علی بن ابی طالبؑ کے اوصاف و مناقب بیان ہوتے ہیں اور جمشید کے ساتھ جو اس دن کا تعلق تھا وہ صرف تاریخ کے اوراق پارہ کی زینت بن کے رہ گیا ہے۔

یہ وارفتگی اور شیفٹنگی مذہب کے ساتھ بضر شمشیر فتح سے حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ اس میں آل محمدؑ کے اس اخلاقی جذب کی تاثیر ہے جس کی امیر المومنین حضرت علیؑ نے ابتدا کی اور آل محمدؑ میں سے ہر فرد نے جسکو برقرار رکھا اور امام رضاؑ نے اپنے ولیعهدی کے دور اور زمانہ قیام خراسان میں جسکو لازوال زندگی بخشدی

یاد رکھئے کہ دنیا کے ہر انسان کے چال چلن کا اثر دوسروں پر پڑتا ہے۔ ہر شخص لامعلوم طریقہ پر اپنے افعال و حرکات سے دوسروں پر اچھا یا بُرا اثر ڈالتا رہتا ہے اور وہ دوسرے اپنے علاوہ دوسروں پر اثر ڈالتے ہیں۔ یہ سلسلہ نسل در نسل چلتا رہتا ہے اس لحاظ سے کسی نیک شخص کی پارسائی، حمدی، نیا صنی، ملنساری، ہمدردی وغیرہ اوصاف کو اہمیت نہ دینا غلطی ہے۔ مگر تاریخ کا ایک خاصہ ہے کہ وہ حرکت کر دیتی ہے سکون پر نظر نہیں ڈالتی۔

اگر آپ ملکوں کی تاریخ قوموں کی تاریخ اور شخصیتوں کی تاریخ کو پڑھئے تو آپ کو جنگ ہنگامہ، شورش اور آدینہ شول کے حالات بڑے شرح و بسط کے ساتھ میں گے لیکن عباد و زہاد کی عبادتوں، ریاضتوں اور تعمیر خلق کی کوششوں کا تذکرہ اکثر ملے ہی گا نہیں اور ملے گا تو ضمنی طور پر سرسری طریقہ سے اور اختصار کے ساتھ

تاریخ اسلام اس سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ فارس و روم کے عزرات تاریخ کے صفحات پر چھائے۔ فتوح الشام، واقعی اور فتوح البلدان، بلاذری اسم بامسمیٰ ہو کر ان ہی موضوعات کی حامل بن گئیں۔ مگر یہودیوں کے باغ میں آب کشی کر کے سہراقت کرنے والا پیغمبر <sup>صلی اللہ علیہ وسلم</sup> کا جانشین اس دور کی تاریخ میں ڈھونڈنے نہیں ملتا۔ حضرت علی کے علاوہ دیگر اماموں کے واقعات زندگی صفحات تاریخ پر نہ آسکے۔ کیونکہ ان میں کمانوں کی کرٹک، نیروں کی بچک اور تلواروں کی چپک نہ تھی۔ مگر خالد بن ولید سے لے کر ابو مسلم خراسانی تک جتنے جرنیل اور کمانڈر تھے سب تاریخی شخصیت بنے ہوئے ہیں۔ کیونکہ یہ شخصیتیں دنیا کی خاموش نصائیں تھیں، مگر علم پیدا کرنے کی وجہ سے تاریخ کے معیار پر پوری اترتی ہیں اور زین العابدین، محمد باقر، جعفر صادق، موسیٰ کاظم وغیرہ اپنی عبادات اپنے علم، اپنے صدق، اپنے ضبط نفس وغیرہ صفات کمال سمیت تاریخی معیار پر پورے ہیں اترتے اس لئے کہ وہ اپنی خاموش سیرت کے ساتھ دنیا کے اسلام کی تعمیر میں کتنا ہی حصہ لے رہے ہوں مگر ان کی زندگی میں سکون ہے اور سکون تاریخ کا ہنر و ہنر کے قابل نہیں اس صورت سے جو اسلامی تاریخ مرتب ہوئی ہوتی اس میں یقیناً بس وہ خون آشام لڑائیاں ہوتیں جو اشاعت اسلام کے نام پر فتوحات کی حیثیت سے اس پاس کے ممالک پر فوج کشی کی صورت میں ہوئیں اور ایسی تاریخ سے مسلمان اپنی جگہ کتنی ہی نازش محسوس کرتے اور غیر انوار کی بہرہ ریزی کا سرمایہ ان میں دستیاب نہیں ہو سکتا تھا۔

ضرورت تھی ایک ایسے واقعہ کی کہ جس میں ہو تو نوعیت جنگ کی، ہو باہمی تصادم اور کشمکش زمین پر بہتے ہوئے خون اور ٹڑپتے ہوئے لاشے ہوں فتح اور شکست اور غالب و مغلوب کا انجام ہو۔ خلاصہ یہ کہ وہ سب باتیں ہوں جن کی وجہ سے تاریخ کی نگاہ اٹھتی ہے۔ جن کی وجہ سے تاریخ اپنی آغوش

کو کھولتی ہے اور واقعات کو جگہ دیتی ہے۔ مگر اس جنگ کی تمہیں اسلام کے  
 سچے اصول کی جاذبیت، اس کی مساوات و اخوت، اس کی خلق خدا کے ساتھ  
 ہمدردی، اس کی حقوق اللہ و حقوق الناس کی محافظت اور اس کی انسانیت کی  
 تعمیر میں تمام گوشہ شمول کا پتھر اس طرح مضمحل ہو کہ اس جنگ کے ساتھ ساتھ یہ  
 تمام باتیں ایسی ہی یا اس سے بہتر تاریخی زندگی حاصل کر لیں جسی فتوحات ملکی لڑائیوں  
 کو حاصل ہے۔

اس واقعہ کے وجود کی وجہ سے تاریخ اسلام میں غیر اقوام کے لئے وہی جاذبیت اور وہی  
 مقناطیسیت پیدا ہو سکے گی جو اصل اصول اسلام اور تعمیر اسلام کی سیرت و زندگی  
 میں موجود تھی اور جس پر فاتحانہ لڑائیوں نے نفرت کے جذبات کا پردہ ڈال کر اقوام  
 عالم کی آنکھوں سے اوچھل کر دیا تھا۔ واقعہ کربلا میں ایک ایسا ہی واقعہ تھا۔ یہ  
 ایک جنگ تھی اور جنگ بھی اٹوٹھی خصوصیتوں اور مخصوص ندرتوں کی حامل جن کی  
 وجہ سے کسی دوسری جنگ سے زیادہ تاریخ اس کو محفوظ رکھتے پر مجبور تھی۔ یہاں  
 بھی کھینچی ہوئی تلواریں تھیں۔ لچکتے ہوئے نیزے تھے۔ کڑکھی ہوئی کمانیں اور  
 سنسناتے ہوئے تیرتھے۔ زمین پر بہتا ہوا خون کٹے ہوئے سر اور ٹپتپتے ہوئے  
 لاشے اور پھر جنگ ایسی جس میں ایک طرف تیس ہزار اور دوسری طرف بہتر ایک  
 طرف سیر و سیراب اور دوسری طرف تین دن کے بھوکے پیاسے، ایک طرف تن و  
 توش دالے قدر اور جوان اور دوسری طرف چند جوانوں کے علاوہ اسی برس  
 کے بڑھے اور کمسن بچے۔ کون سی دنیا کی جنگ ایسی ہوئی ہوگی جس میں قاسم  
 ایسے نابالغ کمسن کا کیا ذکر علی اصغر کا سا شیر خوار بھی قربان ہوا ہو۔

لہذا بحیثیت جنگ کے تاریخ مجبور تھی کہ اس واقعہ کے خصوصیت کو محفوظ  
 کرے۔ اب اگر یہ جنگ بھی کھٹم کھٹا کسی غیر مسلم جماعت اور دوسری قوم کے مقابلہ

میں ہوتی ہوئی تو غیر اقوام کو اس سے ہمدردی نہ پیدا ہوتی۔ بلکہ وہ اسے اسلام کی دوسری لڑائیوں کے ساتھ جو اقوام غیر اور دوسرے مالک کے ساتھ ہوتی ہیں۔ منسلک کر کے اس سے غیریت بلکہ مختصمت محسوس کرتیں۔ مگر اس جنگ کی خصوصیت یہ تھی کہ رسمی طور پر کسی ایک مذہب کی حمایت میں دوسرے مذہب کے خلاف نہ تھی۔ بلکہ ظاہری طور پر ایک ہی مذہب (اسلام) کے پیروں میں جو لوگ اس کے اخلاق اور بلند تعلیمات سے بہت گئے تھے۔ ان کے خلاف لڑی گئی تھی اس لئے دنیا کی دوسری قوم کو اس سے مختصمت نہیں بلکہ ہمدردی پیدا ہوتی ہے اور انہیں اس کے حالات معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ان سے اسلام کے ان اصول اور اخلاقی حدود کا تعارف ہوتا ہے جو حسینؑ اور زیدؑ کے درمیان خطِ فاصل بنے ہوئے تھے اور وہ جب حسنین کی ہمدردی کے جذبہ کے ساتھ ان اصول پر خورد کرتے ہیں تو ان کے دلوں پر اسلام کی عظمت کا سکہ قائم ہوتا ہے اور یہی وہ مقصد تھا جو پیغمبر اسلامؐ کے پیش نظر تھا اور جس کی حسنین نے اپنے خون سے تکمیل کی۔

یہ ایک بڑی خصوصیت ہے واقعہ کر بلا کی جو اسے تاریخ اسلام میں بڑی اہمیت کا مالک بنا دیتی ہے یعنی اگر تاریخ اسلام سے واقعہ کر بلا کو نکال لیا جائے تو غیر اقوام کی ہمدردی کے لئے کوئی پتھر ہمارے پاس نہیں رہ جاتی اور یہ ایک ثابت حقیقت ہے کہ دنیا کی ہر قوم کو حسینی واقعات سے ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔ پھر امام حسینؑ نے اپنے واقعات کے ساتھ اسلامی تعلیمات کو ایسا مدغم کر دیا ہے کہ حسینی تاریخ بغیر ان تعلیمات کے تذکرہ کے مرتب ہی نہیں ہو سکتی اور اس طرح ان واقعات کے ساتھ وہ تعلیمات بھی تھری طور پر تاریخ کا جز بن گئے۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے واقعہ کر بلا کی تاریخی حیثیت ایک مخصوص نوعیت

کے ساتھ وابستہ ہے۔

ختم شمشیر تاریخ کا جزو بنتا ہے مگر خم محراب نہیں۔ تیروں کی بارش تاریخ کی توجہ  
مبذول کتنی ہے، خوف الہی سے آنسوؤں کی بارش نہیں۔ پھر کتنی ہوئی لائیں کو تاریخ  
دیکھتی ہے سجدۃ الہی میں زمین پر گری ہوئی پیشانیوں کو نہیں۔ مگر حسین نے کربلا  
یہ کیا کہ تیروں کی بارش میں نماز جماعت ادا کی۔ اب کیا ممکن ہے کہ تاریخ اس  
نماز کو نظر انداز کر دے، شجر کی دھار کے نیچے خالق کا سجدہ کیا، اب کیا مجال  
کہ تاریخ اس سجدے سے آنکھ بند کر لے۔

اس طرح امام حسین نے تعلیمات اسلام کو تاریخی زندگی کا لباس پہنا دیا۔ جس کی  
مثال واقعہ کربلا کے سوا تاریخ اسلام کے کسی واقعہ میں نہیں مل سکتی۔  
کربلا میں مادیت پرستی اور حق پرستی کا مقابلہ صاف نظر آتا ہے۔ جب  
میدان جنگ میں صفیں مرتب ہوتی ہیں اور فوج شام کا افسر عمر بن سعد تیر چہ  
کمان میں بوڑھے حضرت امام حسینؑ کی طرف رہا کرتا ہے، پکار کے اپنی فوج کو آواز  
دیتا ہے کہ گواہ رہنا، پہلا تیر فوج حسینؑ کی جانب میں لگا رہا ہوں۔ یہاں گواہ کئے  
جا رہے ہیں فوج کے سپاہی۔ کاہے کے لئے؟ حکم وقت کے سامنے گواہی دینے  
کے لئے۔ صاف ظاہر ہے کہ صرف مخلوق کی رضامندی اور مادی فائدے کا حصول  
میر نظر ہے۔ اور ادھر جب حسینؑ کا جوان بیٹا رخصت ہو کے مرنے چلتا ہے تو  
زبان پر کیا الفاظ آتے ہیں؟ خداوند! گواہ رہنا کہ اب وہ جوان جا رہا ہے، جو  
صورت و سیرت میں تیرے رسولؐ کی تصویر ہے۔  
صاف ظاہر ہے کہ جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ صرف اللہ کی خاطر اور خالق کی رضامندی  
کے لئے۔

کیا تاریخ کربلا کی جنگ سے اہل خدا پرستی کے مظاہرہ کو اللہ کر سکتی ہے؟ ناممکن ہے

اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ گھر لوہے کے واقعات جن میں قرابتداروں کے باہمی حقوق گھر والوں کے ساتھ برتاؤ۔ باہمی محبت و سلوک کے کتنے ہی تابناک عمل کے جو اہرات ہوں گے تاریخ انہیں مٹ کر نہیں دیکھتی۔

حضرت امام حسینؑ کو بلا میں اپنے عزیزوں کو اور اس سے بھی بڑھ کر اہل حرم یعنی بی بیوں اور بچوں کو ساتھ لائے اور اب حسبتی کارنامہ کے ذیل میں اعزاء کے حقوق قرابتداری میں اور بھائی کی غیر معمولی محبت۔ شوہر اور زوجہ کی باہمی وفاداریاں غرض کتنے ایسے زندگی کے پہلو مضمحل ہو گئے ہیں جنہیں عموماً تاریخ اپنے دامن میں لیتی ہی نہیں

اس کا قطعی ثبوت چاہتے ہوں تو یہ دیکھئے کہ آخر حضرت امام حسینؑ اور محرم ۱۰ کے پہلے بھی تو امام حسینؑ ہی تھے۔ یقیناً آپ کی پوری زندگی ہی حقوق

اللہ اور حقوق الناس اور اعزاء کے ساتھ صلہ رحم اور گھر والوں کے ساتھ مراعات میں ایسی ہی مثالی تھی کہ جیسی وہ کر بلا کے میدان میں نظر آتی ہے۔ مگر کیا بات ہے کہ ستاؤن برس کی عمر میں صرف ایک ہی دن کے جزئیات و واقعات ہیں جو تاریخ کی زبان سے ہم تک پہنچے ہیں اور اس دن کے پہلے کے ستاؤن برس کے واقعات ہرگز مسلسل اور مرتب طور پر ہمیں دستیاب نہیں ہوئے

اب تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ یہ صرف واقعہ کر بلا کی خصوصیت ہے کہ اس میں رزمیہ کارنامہ کے ساتھ چونکہ زندگی کے دوسرے پہلو منسلک ہو گئے تھے اس لئے انہیں تاریخ زندگی حاصل ہو سکی۔ اور اب آپ کو واقعہ کر بلا کی مخصوص اہمیت تسلیم کرنا پڑے گی۔ جس نے تمدن اسلامی کے ہر اجتماعی اور انفرادی معاشرتی اور منزلی پہلو کو اس طرح تاریخ کا جزو بنا دیا جو بغیر اس کے قطعاً ناممکن تھا:

علیٰ نقی النقی

اہمیشن کے مطبوعہ ملنے کا پتہ:۔ سید حسن علی شاہ کاظمی جنرل سیکرٹری اہمیشن پاکستان۔ لاہور۔